دارالعلوم دیوبند، تحریک علیگڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ندوۃ العلماء کا قیام: اسباب واثرات، تحقیقی جائزہ

* ڈاکٹر غلام یوسف

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں برصغیر پاک وہند میں مغربی استعمار کی پے در پے کامیابیوں اور مسلمانان عالم کے ابتلاء کا زمانہ تھا، خصوصاً پاک وہند کے مسلمان شدید کشمکش سے دوچار تھے، کیونکہ 1857ء کی جنگ آزادی سے قبل ان کے اقتدار کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں اسلامی شوکت وعظمت اور سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ (1857ء) گُل ہو چکا تھا، اور سبز رنگ کا قومی نشان، صلیبی نشان کے سامنے سرنگوں ہو چکا تھا۔ دہلی کے لال قلعہ پر اسلامی پرچم کے بجائے یونین جیک لہرا رہا تھا۔ اسلامی شعائر و اقتدار روبہ زوال تھے، تعلیمی ادارے مالی معاونت وسرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے آخری سانس لے رہے تھے یا اپنی افادیت کھو چکے تھے۔ مختلف زاویوں سے علمی خانوادوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی منصوبہ بندی کی چکی تھی۔ امت مسلمہ کا دینی شعور رخصت ہو رہا تھا، جہالت وضلالت اور ظلمت کی تاریک گھٹائیں امت مسلمہ کے دلوں پر چھاتی جارہی تھیں۔

مشرقی علوم وفنون اور تہذیب کی روشنیاں مدہم ہورہی تھیں، مغربی تہذیب وتمدن کی یلغار اپنی پوری شان وشوکت، تنظیم و منصوبہ بندی اور جدید آلات حربیہ کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ مسلمان حریت اور استخلاص وطن کی آخری جدوجہد میں ناکام ہو چکے تھے۔ جب مسلمانوں کو کچھ ہوش آیا انکی حالت ناگفتہ بہ تھی حکومت ختم ہو چکی تھی صنعت اس سے پہلے برباد کی جا چکی تھی، املاک و اوقاف، جائیدادیں ضبط کی جا چکی تھیں، سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی قرار دی جا چکی تھی جس کے نتیجہ میں مسلمان قوم، قومی انتشار، خودغرضی، اور نفس پرستی میں مبتلاء ہو چکی تھی۔

یہ سانحہ اچانک رونما نہیں ہوا، بلکہ مسلم دشمن قوتیں تقریبا تین سو پچاس کی طویل جدوجہد اور جامع منصوبہ بندی کے بعد کامیاب ہوئیں۔ برصغیر پاک وہند میں انگریزوں نے بتدریج قدم جمائے، سب سے پہلے (20 مئی، 1498ء) کو واسکوڈی گاما کی زیر قیادت، یورپی اقوام میں سے پرتگیزی، ایک عرب ماہر بحریات احمد بن ماجد کی رہنمائی میں یہاں پہنچے، پھر دوسری یورپی اقوام نے آنا شروع کیا، اس کے بعد فرانسیسی اور انگریز آئے اور بالآخر برصغیر پاک وہند کے اقتدار پر انگریز قابض ہوئے اور آہستہ آہستہ یہاں کے حکمران بن گئے۔ انگریزوں نے دوستی اور دشمنی کے طویل المیعاد منصوبے بنا کر اس علاقہ کو فتح کیا(1)۔

---

* ایسوسی ایٹ پروفیسر/چیئرمین شعبہ فقہ واسلامی قانون، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

تعلیمی اداروں کے قیام کے اسباب و پس منظر

مسلم تعلیمی اداروں کے قیام کے بہت سے اسباب تھے جن میں چند نمایاں اسباب درج ہیں:

① انگریزوں نے برصغیر پاک و ہند پر قبضہ و حکمرانی کے بعد مسلمانوں کی ملی وحدت کے حصار میں شگاف ڈالنے شروع کئے۔ دنیاوی دولت و عزت کے خواہش مند نام نہاد علماء و مشائخ کی سرپرستی کر کے اُن کو اپنا ہمنوا بنایا۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی واپسی کی کوشش کرنے والے مجاہدین کو وہابی قرار دے اُن کی کردار کشی کی گئی، تاکہ عام مسلمان ان سے متنفر اور بدظن ہو جائیں۔ اور اسلام کے تصور جہاد کا مکمل طور پر قلع قمع کرنے لئے ہمہ جہتی کوشش کی گئیں۔ برطانوی عملداری کو استحکام دینے کے لیے درج ذیل منصوبہ بندی کی گئی:

② برصغیر پاک و ہند پر قبضہ و حکمرانی اور سیاسی دوام و استحکام اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک مسلمانوں میں جہاد کی روح کارفرما ہے۔ جذبہ جہاد کو کیونکر ختم کیا جاسکتا ہے؟۔

③ ہندوستان کی آبادی جو مختلف النوع عناصر سے مرکب تھی اُن کے مابین عموماً مسلمانوں اور ہندوں کے مابین خصوصاً مغائرت و منافرت اور مذہبی و سیاسی تصادم کیسے پیدا کیا جاسکتا ہے؟

④ قرآن و سنت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رکیک حملوں کا محاذ کھولا گیا۔ تاکہ مسلمان کسی قسم کے اقدام کے بجائے مدافعت پر مجبور ہو جائیں؟ مجادلہ کے بجائے بحث و مباحثہ اور مناظرہ کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

⑤ مسلمانوں میں نئی فرقہ بندی پیدا کر کے ایسے عقائد پھیلائے جائیں جن سے اُن کی ملی وحدت پراگندہ ہو جائے باہم منافقت و مجادلت اور مناظرہ بازی میں مبتلا ہو کر اُن کی صلاحیتوں کو پامال کیا جائے۔

⑥ فرنگی سامراج نے ایک طرف تو سرزمین ہند کی منفرد مسلم سلطنت پر قبضہ جما لیا تھا اور دوسری طرف اسلام کے مقدس عقائد و نظریات میں کفر و شرک کی آمیزش کرانے کے لیے علماء و مشائخ کے کے روپ میں ایسے ایجنٹ تیار کروائے جو قرآن و سنت کی ایسی غلط تعبیر و تشریح کریں جس سے اسلام اور کفر میں فرق ختم ہو جائے۔

⑦ مغربی استعمار نے بھی اولین مرحلے میں مسلمانوں کی فکری و نظری اساس پر حملہ کیا اور اِس کے لیے انہوں نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کے اندر تشکیک و الحاد اور اپنے مخصوص نظریہ اباحیت و عریانیت، تجدد پسندی کے اثرات پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ نصوص قرآن و سنت کی من مانی تاویلیں کرنے کی سوچ کی سرپرستی کرتے ہوئے اِسے پروان چڑھایا۔ انگریزوں کی آمد نے برصغیر پاک و ہند میں ثقافتی انقلاب برپا کر دیا۔ مسلمان، ان کا نظام تعلیم، ان کی اسلامی اقدار، احترام دین و تعظیم علماء اور ان کا جذبہ حبُ الوطنی ایسی خصوصیات تھیں جو مغربی افکار کے پھیلاؤ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنیں۔

انگریزوں نے ایسی منصوبہ بندی کی جو مسلمانوں کے دلوں سے جذبہ دین اور احترام علماء کے خاتمے میں ممد و معاون ثابت ہو اور انجام کار وہ اپنے مذہب سے متنفر ہو کر انگریزوں کے وفادار بن جائیں، بلکہ مسلمان انگریز کے وجود ہی کو اپنی عافیت و سلامتی تصور کرنے لگیں۔ چنانچہ انگریزوں نے مذکورہ ایجنڈے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو تعلیمی پالیسی بنائی تھی اُس کے چند اہم نکات یہ تھے۔

① کمپنی کی حکومت کا واضح مقصد انگریزی زبان اور مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کرنا تا کہ یہاں کے لوگ مغربی تہذیب اور مغربی مذہب کو قبول کر لیں۔

② دوسرے درجے میں انگریزی زبان جاننے والے ایسے منشیوں اور کلرکوں کی فوج تیار کرنی تھی جو حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کا کام دے سکے۔

③ جب تک ایسے کلرکوں کی ایک معقول تعداد تیار نہیں ہو جاتی، اس وقت تک مسلمانوں کے نظام تعلیم کو بدرجہ مجبوری گوارا کرنا، تا کہ کاروبار حکومت میں خلل نہ ہو۔

④ اسلامی تعلیمات کو بہر حال ختم کرنا، فارسی زبان کی بالا دستی اور ہمہ گیریت کو ختم کرنا اور فارسی کی جگہ انگریزی کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنانا(2)۔

برطانوی پالیسی کے اثرات

انگریزوں نے غور فکر کے بعد دینی تعلیم کے خلاف ایک جامع منصوبہ تیار کیا۔ پھر اس پر رازداری اور مستقل مزاجی سے برسوں عمل ہوتا رہا، اس کے بعد ملک میں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے جن کی وجہ سے مدارس بند ہوتے چلے گئے، ان کے قدر دانوں میں بتدریج کمی ہوتی چلی گئی ان ذرائع و وسائل پر حکومت قابض ہوگئی، یہ سب کچھ مخفی طریقہ پر ہوتا رہا نتیجہ انگریزوں کے حسب پسند نکلا اور مدارس ویران ہو گئے۔

① دینی مدارس اور علماء سے مسلمانوں کو بدگمان کرنا۔

② دینی مدارس کے فارغ التحصیل افراد پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند کرنا۔

③ دینی مدارس کے وسائل مالیہ پر حکومت کا غاصبانہ قبضہ کرنا۔

دینی مدارس اور علماء کے خلاف مہم

انگریزوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں میں مذہب، اور مذہبی اقدار مسلمان معاشرہ میں غالب عنصر ہے۔ علمائے کرام معاشرہ میں اہم طاقت ہیں، عوام کی قیادت اور سربراہی علماء کے ہاتھوں میں ہے جب تک مسلمان معاشرہ میں علماء کی گرفت کو کمزور

نہیں کیا جاتا اس وقت تک مسلمانوں کو کسی دوسری راہ پر چلانا دشوار ہوگا۔ اس لئے انگریزوں نے ایک خفیہ مہم کے ذریعے اس طبقے کو بدنام کیا صحیح اور غلط قسم کے الزامات لگائے گئے، یہ پروپیگنڈا اس زور وشور سے کیا گیا کہ سارے ملک نے اور خود مسلمانوں کے ایک بڑے حصّے نے یقین کر لیا کہ واقعی یہ علماء برے، تنگ نظر، متعصب، ترقی کے دشمن اور سائنس کے خلاف ہیں۔ ان کا وجود ہی قوم کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ علماء کی جانب سے صفائی کا کبھی موقعہ فراہم نہیں کیا گیا اور اگر انھوں نے حقیقت حال کبھی پیش بھی کی تو اسکی شنوائی نہیں ہوسکی (3)۔ اس نفسیاتی مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولوی اور ملّا کا لفظ تنگ دلی اور خرابیوں کے ہم معنی بن گیا یہی وجہ ہے کہ آج کوئی مسلمان خواہ وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتا ہو یا دینی مدارس کا فارغ التحصیل ہو، اپنے آپ کو ملّا کہلانے کا روادار نہیں۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں پر اقتصادی دباؤ

برطانوی حکومت نے اپنی پالیسی کے مطابق سب سے بڑا ظلم یہ ڈھایا کہ پڑھے لکھے مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے، اور رزق کے ذرائع مسدود کر کے ان کو نان شبینہ کا محتاج بنا کر چھوڑ دیا، اور بعض مقامات پر مسلمانوں سے داڑھی ٹیکس بھی وصول کیا جاتا تھا (4)۔ 1846ء کے قوانین بازیافت کی وجہ سے بڑے مسلمان جاگیرداروں کی جاگیروں کی بحق سرکار ضبطی جس کی زد میں آ کر لاکھوں علماء اور فضلاء و مشائخ خانوادے محتاج بن کر در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیئے گئے۔ 10 اکتوبر 1844ء کو لارڈ ہارڈنگ نے ایک نیا قانون نافذ کیا کہ آئندہ سے ملازمت صرف انگریزی خواندہ افراد ہی کو ملا کرے گی جس کے بعد سے عربی و فارسی کے فاضل افراد ملازمت کے لئے نااہل قرار پائے (5)۔

ولیم ہنٹر لکھتا ہے:

> ''تعلیم یافتہ مسلمان جن کو پرانے طریقہ تعلیم پر ناز ہے حکومت کے ان عہدوں پر اور ملازمتوں میں کوئی جگہ نہیں پاتے جن پر اس سے بیشتر ان کی اجارہ داری قائم تھی۔ وہ حیران ہیں کہ یہ سب کچھ اور دیگر ذرائع زندگی قابل نفرت ہندوؤں کے ہاتھ میں چلے گئے یا چلے جا رہے ہیں جن مسلمانوں کی تعلیم ذرا بہتر ہوتی وہ بھی نالاں ہیں گو ان کا یہ احساس مذہبی ایذا رسانی کی حد تک نہیں پہنچا۔ اگرچہ ان مذہبی خیالات کے مطابق لاپروائی کی حد تک ضرور پہنچ جاتا ہے'' (6)۔

ان معاندانہ پالیسیوں کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ 1869ء تک کہ آسودہ حال مسلمان علماء، فضلاء نوابین اور امراء کی اولادیں لکڑہارے اور سقّے (Hewers to wood and Drawers of water) بن جانے پر مجبور ہوگئیں (7)۔ اگر کہیں مسلمانوں کو نوکری ملتی بھی تھی تو بقول ہنٹر ''سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی، چپراسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں'' (8)۔ عبداللہ یوسف علی ان حالات پر

روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: ''بنگال میں دولتمند طبقہ ہندو تاجروں، ساہوکاروں اور بنیوں کا تھا، مسلم شرفاء اور اہل کاروں، نیز ہندو زمینداروں کی حالت تباہ ہوگئی عوام نے اپنے قدیم لیڈروں اور حقیقی رہنماؤں کا ساتھ چھوڑ دیا.....وارن ہیسٹنگز کا جمعدار تو کلکتہ میں اراضی کا مالک تھا اور شاہان مغلیہ کی اولاد یا تو فاقے کرتی تھی یا لوگوں کی خیرات پر زندگی بسر کر رہی تھی (9)۔

مدارس کے ذرائع آمدنی کو مسدود کرنا

دینی مدارس کے لیے مالی وسائل مسلمان بادشاہوں وغیرہ کے عطا کردہ اوقاف اور جاگیروں سے حاصل ہوتے تھے، لاکھوں مدارس ان اوقاف سے چلتے تھے۔ جب مرہٹوں اور سکھوں کو غلبہ حاصل ہوا تو ان میں سے کسی نے ان جائیدادوں سے تعرض نہ کیا انگریزوں کی دوررس نگاہوں نے محسوس کرلیا کہ ان مدارس کا خاتمہ ممکن نہیں جب تک ان اوقاف اور جاگیروں کو قبضہ میں نہ لیا جائے چناچہ انگریزوں نے تمام اوقاف کو بتدریج ضبط کرلیا (10)۔

انگریزی تعلیم کے اجراء کے مقاصد

لارڈ میکالے نے جب ۷، مارچ ۱۸۳۵ء/۷ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ کو تعلیمی کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی زبان میں تعلیم دی جانے کی حمایت کی تھی تو اس نے اپنی رپورٹ میں اپنی رائے کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی:۔''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو (11)۔

عیسائیت کا پرچار

انگریزی تعلیم کے اجراء کا دوسرا واضح مقصد عیسائیت کا پرچار تھا جیسا کہ آنریبل مسٹر انفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن خود اس کا علانیہ اعتراف کرتے ہیں:''میں اعلانیہ نہیں تو درپردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارے میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں۔ اگرچہ تعلیم سے انکی آراء میں ایسی تبدیلی نہ ہوسکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ اس سے زیادہ ایماندار اور محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے (12)۔

برطانوی حکومت کی طرف سے انگریزی تعلیم کے لیے عیسائی مبلغین کی مالی اور مادی امداد کی گئی تاکہ وہ پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم دیں جیسا کہ سرسید احمد خان ''اسبابِ بغاوت ھند'' میں ان طریقوں کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے ذریعے مسلمانوں کو عیسائی بنایا گیا۔ سرسید احمد خان کی اس تحریر کی انگریزوں کی جانب سے آج تک کوئی تردید نہیں کی گئی، چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''ہر شخص دل سے جانتا تھا کہ ہماری گورنمنٹ کے احکام بہت آہستہ ظہور میں آتے ہیں اور جو کام کرنا ہوتا ہے رفتہ رفتہ کیا کرتے ہیں اور خفیہ تدبیریں کر کے جس طرح عربی اور سنسکرت کو فنا کر دیا اسی طرح ملک کو مفلس اور محتاج اور جاہل بنا کر اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کریں گے'' (13)۔ ''1253ھ/ 1837ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کئے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی شمالی میں ارادہ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح پر مفلس اور محتاج کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے'' (14)۔

جو اس ملک میں نوکر ہیں وہ پادری صاحبوں کو بہت سا روپیہ واسطے خرچ کے اور کتابیں بانٹنے کو دیتے ہیں اور ہر طرح ان کے مددگار اور معاون ہیں۔ اکثر حکام معتمد اور افسران فوج اپنے تابعین کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی پر آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو'' (15)۔ ''مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور ان میں مذہبی تعلیم شروع ہوئی سب لوگ کہتے تھے کہ سرکار کی طرف سے ہیں بعض اضلاع میں بہت بڑے بڑے عالی قدر حکام معتمدان اسکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے امتحان مذہبی کتابوں میں سے لیا جاتا تھا اور طالبعلموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے پوچھا جاتا تھا کہ تمھارا خدا کون، تمھارا نجات دینے والا کون، اور وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے اس پر ان کو انعام ملتا تھا (16)۔

'' لڑکیوں کی تعلیم کا بہت چرچا ہندوستان میں تھا اور سب یقیناً جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکولوں میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں کہ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا'' (17)۔ ''اسی زمانہ میں بعض اضلاع میں تجویز ہوئی کہ قیدی جیل خانوں میں ایک شخص کے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں جس سے ہندوؤں کا مذہب بالکل جاتا رہتا تھا، مسلمانوں کے مذہب میں اگرچہ کچھ نقصان نہیں آتا تھا مگر اس کا رنج سب کے دل پر تھا کہ سرکار ہر ایک کا مذہب لینے پر آمادہ اور ہر طرح پر اس کی تدبیر میں ہے'' (18)۔

اس طرح کے شواہد سے با آسانی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے اپنی سابقہ تعلیمی پالیسی پر نظر ثانی کر کے ایک ایسی تعلیمی پالیسی اپنائی جس سے مندرجہ ذیل مقاصد کا حصول مطلوب تھا:

① ہندوستان میں برطانوی حکومت کے دوام و استحکام کے لئے وفادار فوج تیار کرنا۔

② جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو اسلام اور اسلامی اقدار سے اعلان برات نہ کرے تو کم از کم اظہار نفرت تو کرے۔

③ قرآنی احکام کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں کہ وہ تاج برطانوی سے ایفا کریں، لہٰذا انکو اسلامی احکامات ہی سے ناواقف رکھا جائے۔

④ جو مسلمان انگریزوں کے مرتب کردہ نصاب تعلیم سے استفادہ نہ کریں انکو تنگ نظر، جاہل، مذہبی، مجنون اور پاگل وغیرہ القاب سے نوازا جائے۔

⑤ اس نصاب تعلیم سے استفادہ کرنے کے بعد نہ صرف برطانوی حکومت کے ایماندار و جانثار غلام بن جائیں بلکہ ان میں مذہبی منافرت پیدا ہو اور ہندو مسلم تنازعات شروع ہوں اور ''تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو'' کا فارمولہ کامیابی سے ہمکنار ہو۔

⊙ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کوئی قوم کسی ملک پر فاتحانہ قبضہ کرتی ہے، تو فاتح قوم کا اثر ونفوذ صرف مفتوح اقوام کے جسموں تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو بھی تسخیر کرنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مغلوب قوم مرورِ زمانہ کے ساتھ اپنے خصائص و روایات اور مذہبی شعائر و علامات کو نہ صرف نظر انداز کر دیتی ہے بلکہ ان سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ ہندوستان کے بیدار مغز مسلمانوں نے اس خطرے کا احساس کر لیا تھا کیونکہ 1712ء سے 1857ء تک کی برطانوی معاندانہ کاروائیوں کا وہ مشاہدہ و مطالعہ کر چکے تھے، اس وقت ان کے سامنے دو اہم مسئلے تھے، ایک مسئلہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کے تحفظ کا تھا اور دوسرے مسئلے کی نوعیت سیاسی تھی جس کا مقصد ہندوستان کو انگریزوں کے اقتدار سے نجات دلانا تھا۔

فوری طور پر مسلمانوں نے مسئلہ اوّل کی طرف توجہ دی کیونکہ دوسرے مسئلے کے لئے کوشش کرنا سوائے ہلاکت و بربادی کے اور کچھ حاصل نہ تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے بیدار مغز مسلمان اربابِ فکر و علم غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ سیاسی قوت سے محروم ہو جانے کے بعد اب اگر قومی سلامتی کے تحفظ کا کوئی راستہ ہے تو وہ صرف تعلیم کا راستہ ہے، کیونکہ تعلیم کے حصول کے بغیر وہ ایک زندہ قوم کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے لیکن اس ضرورت شدیدہ کے احساس کے باوجود مسلم مفکرین دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

ایک جماعت تو علماء کرام کی تھی جنہوں نے اپنی پوری توجہ قدیم نصابِ تعلیم پر مرکوز کی۔ اور دینی مدارس کے احیاء کی کوششیں شروع کیں تاکہ ان مدارس میں قرآن وسنت اور علوم اسلامیہ کی تعلیم دی جا سکے۔ اور دوسری جماعت متجددین کی تھی جن کے خیال میں مسلمانوں کی فلاح و کامیابی انگریزوں کی زبان اور ان کے علوم وفنون سیکھنے میں ہے۔ گویا اس وقت مسلم مفکرین قدیم تعلیم یافتہ طبقہ اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں منقسم تھے۔ جو فکر و دماغ کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد تھے اور دونوں کی درس گاہیں بھی الگ الگ نام سے موسوم ہوئیں (مکتب، مدرسہ، دارالعلوم، اسکول، کالج، یونیورسٹی)، جو آگے چل (قیام دارالعلوم دیوبند 15 محرم 1283ھ/ 30 مئی، 1866ء، تحریک علی گڑھ، ربیع الاوّل 1290ھ/ 24 مئی 1875ء، قیام ندوۃ العلماء، شوال 1311ھ/ اپریل 1896ء اور قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ 1920ء) کے نام سے معروف ومشہور ہوئیں۔ ذیل میں انہی بنیادی تعلیمی اداروں کا مختصر ذکر زمانی ترتیب کے پیش کیا گیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام

دہریت، کفر والحاد، فطرت پرستی اور بے حیائی کا سیلاب بڑھ رہا تھا، جبکہ اسلامی چمن پر خزاں کا دور دورہ تھا، اور یہ یقین ہو چلا تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں بھی اندلس واسپین کی تاریخ دہرانے کے لیے، شر و فساد کی تمام طاغوتی قوتیں کمر بستہ ہو چکی ہیں۔ کہ اچانک چند نفوس قدسیہ ستم رسیدہ امت مسلمہ کو بچانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جنہوں نے مسلمانوں کی قومی زندگی، دینی غیرت وحمیت کے دفاع میں مختلف جہات سے کوششیں شروع کیں۔ مثلاً تحریکِ جہاد (زیر سرپرستی شاہ اسماعیل شہید) 1822ء سے 1832ء اور تحریک آزادی ہند 1857ء اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

تحریک آزادی ہند میں انگریزوں نے تقریباً سات ہزار علماء کو تہہ تیغ کیا (19) اس لیے ایسے افراد کا فقدان ہو گیا جو دور اندیش ہوں اور معاملہ فہم ہوں، مسلمانوں کے مذہبی مدارس کے بارے میں انگریزوں کی جو حکمت عملی تھی اس کی وجہ سے صاف ظاہر ہے کہ عربی مدارس کس طرح قائم رہ سکتے تھے؟ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتے گئے حتی کہ 1857ء کے ہنگامہ نے تقریباً ان کا خاتمہ کر دیا۔ تاہم مذہبی علوم کو زندہ کرنے کی ایک تحریک مسلمانوں میں پیدا ہوئی، کیونکہ ملک میں جو نظام تعلیم رائج کیا گیا تھا وہ سراسر مادّی اور مسلمانوں کے دینی اور ملّی تقاضوں کے بالکل منافی تھا، اسلامی دور کی تدریسی سہولتیں بھی سب ختم کر دی گئی تھیں۔ اس وجہ سے مسلمانوں کی نوخیز نسلیں جہالت اور بے دینی کا شکار بنتی چلی جا رہی تھی۔

تعلیم مسلمانوں کے لیے دینی فریضہ ہے کسی صورت میں بھی ہو وہ اس سے غافل نہیں ہو سکتے اس وقت قوم کے چند محسنوں اور غمخواروں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے ملّی وجود کے تحفظ علوم نبوت اور اسلامی معاشرے کو بچانے کی کیا صورت اختیار کی جائے اور ان کے دینی شعور اور ایماندارانہ سیاسی فکر کو حیات نو کس طرح بخشی جائے۔ چنانچہ ایک مختصر سی جماعت جس کی سربراہی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہاتھ میں تھی (20) نے، ایک تجویز دی کہ ایک دینی درس گاہ قائم کی جائے اس کی تعلیم و تربیت اور علم و عمل کے ذریعہ ڈوبتے ہوئے مسلمانوں کو سہارا دے کر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا جائے (21)۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ کے جانشینوں نے بروز جمعرات، شمالی ہند کی اس تاریخی بستی ''دیوبند'' میں محرم 1283ھ/ 30 مئی، 1866ء کو چھتہ والی مسجد میں ایک انار کے درخت کے نیچے صرف دو آدمیوں (ایک استاذ اور ایک شاگرد) کے ذریعہ ''دارالعلوم دیوبند'' کا آغاز کیا، حسن اتفاق سے دونوں کا نام محمود تھا ایک معلّم محمود اور دوسرا متعلم محمود جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے معروف زمانہ ہوا (22)۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت وسائل کی عدم دستیابی اور بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ پوری کوشش کے باوجود صرف تیس روپے چندہ ہو سکا، اور اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ کرتے ہوئے افتتاح کا فیصلہ کیا گیا (23)۔ اس ادارہ نے انتہائی سرعت کے ساتھ مختصر سی مدت میں احیائے دین کی ایک عالمی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ پہلے ہی سال کے اختتام تک دیوبند میں طلبہ کی تعداد اٹھتر 78 ہو گئی، جن میں اٹھاون بیرونی طلبہ مقیم تھے جن میں سے باون طلبہ کے کھانے وغیرہ کا بندوبست اہل دیوبند کی

طرف سے تھا اور چھ طلبہ اپنے کھانے پینے انتظام خود کرتے تھے (24) ۔

دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب تھے جبکہ پہلے مہتمم حافظ سید عابد حسین بنائے گئے ،دورہ حدیث کا آغاز (1289ھ/ 1873ء) کو ہوا۔اور دورہ حدیث سے فارغ التحصیل اوّلین پانچ طلبہ کی سند تکمیل اور دستار فضیلت کی تقریب 19 ذیقعدہ، 1290ھ /9 جنوری 1874ء کو دیوبند کے بانیان حضرات کے ہاتھوں ہوئی (25) یہ پانچ ابتدائی فاضلین شیخ الھند مولانا محمود الحسن ،مولانا عبدالحق ساکن پوری، مولانا فخر الحسن گنگوہی ،مولانا فتح محمد تھانوی اور مولانا عبداللہ صاحب جلال آبادی تھے (26)۔

یہ ولولہ انگیز انقلابی جماعت معمر افراد پر مشتمل نہ تھی بلکہ نوخیز نوجوانوں پر مشتمل تھی ان میں سوائے مولانا ذوالفقار علی کے جن کی عمر اس وقت 45 سال تھی باقی کوئی بھی پینتیس سال سے زائد کا نہ تھا۔دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت بانیان کی عمریں درج ذیل تھیں:

مولانا ذوالفقار علیؒ (پیدائش:1237ھ/1822ء) کی عمر دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت پینتالیس (45) سال تھی ان کی وفات 1322ھ/1906ء میں چھیاسی (86) سال کی عمر میں ہوئی (27) مولانا فضل الرحمٰنؒ (پیدائش:1247ھ/ 1831ء) کی عمر دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت پینتیس (35) سال تھی اور ان کی وفات 1325ھ/ 1907ء میں چھہتر (76) سال کی عمر میں ہوئی (28) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (پیدائش:1248ھ/1832ء) کی عمر دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت چونتیس (34) سال تھی ان کی وفات 1297ھ/ 1880ء میں انچاس (49) سال کی عمر میں ہوئی (29)۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (پیدائش:1249ھ/1833ء) کی عمر دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت تینتیس (33) سال تھی ان کی وفات 1302ھ/ 1885ء میں ترپن سال (53) سال کی عمر میں ہوئی (30)۔حاجی عابد علیؒ (پیدائش:1250ھ/ 1834ء) کی عمر دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت بتیس (32) سال تھی ان کی وفات 1331ھ/1912ء میں بیاسی سال (82) سال کی عمر میں ہوئی (31) ۔مولانا رفیع الدینؒ (پیدائش : 1252ھ/ 1836ء) کی عمر دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت تیس (30) سال تھی ان کی وفات 1308ھ/ 1890ء میں چھپن سال (56) سال کی عمر میں ہوی (32)۔

اسلامی عہد حکومت میں مدارس کے لیے حکومتوں کی جانب سے اوقاف مقرر ہوتے تھے جن سے مدارس کے اخراجات پورے کئے جاتے تھے،مگر جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو اسلامی حکومت کے قائم کردہ اوقاف بحق سرکار ضبط ہو چکے تھے۔اس لیے اب ضرورت تھی کہ اوقاف کے سابقہ طریقے پر بھروسہ کرنے بجائے دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے اور یہ طریقہ عوامی چندے کا تھا جس میں نہ حکومت کی مالی امداد شامل ہو اور نہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی، تاکہ سرکاری اثرات سے یہ درس گاہ آزاد رہے۔

دارالافتاء کا قیام

دارالعلوم دیوبند میں فتاوی کا آغاز، 1293ھ/ 1876ء سے ہوگیا تھا، سب سے پہلے مفتی مولانا محمد یعقوب تھے انکی وفات (1302ھ/ 1884ء) کے بعد فتوی نویسی مختلف مدرسین انجام دیتے رہے۔ 1304ھ/ 1887ء میں ارباب شوری نے مستقل "دارالافتاء" کی تجویز کی منظوری دی اور مستقل مفتی رکھنے کے لیے چندہ کی اپیل کی گئی یہ اپیل 1304ھ/ 1887ء میں کی گئی تھی اور 1310ھ/ 1892ء میں مستقل مفتی کا تقرر ہوا(33)۔ مفتی عزیز الرحمٰنؒ میرٹھ سے دارالعلوم دیوبند کے مطالبے پر واپس دیوبند آگئے، جہاں نائب مہتمم اور درس وتدریس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے (1310ھ/ 1892ء میں) پہلے باضابطہ مفتی مقرر ہوئے (34)۔

بانی دارالعلوم دیوبند کا دستور العمل

مولانا قاسم نانوتوی نے جو آٹھ بنیادی اصول وضع کئے تھے ان اصولوں کو دیکھنے کے بعد بآسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان اصولوں کے دو بڑے مقاصد تھے:

(الف) دارالعلوم دیوبند اور اس طرز کے دیگر دینی مدارس سے ایسی تربیت یافتہ جماعت تیار ہو جائے جو اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق اعلانیہ کلمہ حق کا اظہار کرے۔

(ب) ان مدارس کا تعلق عام مسلمانوں کے ساتھ قائم کرنا تاکہ مسلمانوں میں خود بخود ایک نظم پیدا ہو جائے جو ان کو اسلام کی اصل صورت پر قائم رہنے میں معاون بنے۔ ان آٹھ اصولوں میں سے اصول نمبر 6، 7 اور 8 ملاحظہ ہوں:

اصول نمبر 6: اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل نہیں تب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت، یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا، اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

اصول نمبر 7: سرکاری شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

اصول نمبر 8: تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حُسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے (35)۔

دارالعلوم دیوبند کے اثرات

دارالعلوم دیوبند کے قیام کو مدارس کے قیام کی ہمہ گیر تحریک سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کیونکہ دیوبند کے چند بہی خواہوں نے

جن مقاصد کے لئے دارالعلوم دیوبند قائم کیا تھا وہ مقاصد سہارنپور کے ایک گمنام قریہ میں صرف ایک مدرسہ قائم کردینے سے پورے نہیں ہوسکتے تھے ضرورت تھی کہ اس جذبے کو عام کیا جائے اور پورے ہندوستان میں مدارس دینیہ کا ایک جال بچھادیا جائے۔ چنانچہ 15 محرم 1283ھ/ 30 مئی ،1866ء میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا اور اس کے چھ ماہ بعد یکم رجب 1283ھ/ 9 نومبر 1866ء کو ''جامعہ عربیہ مظاہر علوم سہارنپور'' کی بنیاد رکھی گئی اس ادارہ کے قیام میں بھی دارالعلوم دیوبند کے احباب و بانیان کا حصہ تھا اور دارالعلوم دیوبند ہی کے مقاصد تعلیم وتربیت کے لئے اس کا وجود عمل میں آیا (36)۔

اسی طرح 1296ھ/ 1879ء میں ''مدرسہ قاسمیہ مرادآباد'' قائم ہوا جس کی بنیاد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے رکھی ،اس کے چند سال بعد مولانا نانوتویؒ کے ایما پر'' جامعہ اسلامیہ عربیہ'' کے نام سے امروہہ میں ایک مدرسہ قائم ہوا بعد میں اس کا نام مدرسہ قاسمیہ عربیہ رکھا گیا، 1312ھ/ 1895ء میں ''مدرسہ رشیدیہ'' کے نام سے جالندھر میں ایک مدرسہ قائم ہوا، 1325ھ/ 1907ء کو ''مدرسہ نعمانیہ'' کے نام سے امرتسر میں دینی ادارہ قائم ہوا، دہلی کی مشہور دینی درسگاہ مدرسہ امینیہ، کراچی کے محلّہ کھڈہ میں 1884ء/ 1301ھ کو'' مدرسہ مظہر العلوم'' کے نام سے ایک مدرسہ وجود میں آیا۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے (گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدرآباد میں) ''دارالرشاد'' کے نام سے 1318ھ/ 1901ء میں ایک مدرسہ قائم کیا، بعد میں 1330ھ/ 1912ء کو اسی نام سے نواب شاہ میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ (37)۔ غرضیکہ دارالعلوم کے قیام کے بعد تقریباً پچاس سال کے عرصہ میں سینکڑوں مدارس قائم ہوگئے جن کی کڑیاں دارالعلوم دیوبند سے ملتی ہیں۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''دارالعلوم دیوبند برّصغیر کی وہ عظیم علمی درسگاہ ہے جس نے گذشتہ صدی میں عالم اسلام کی مایۂ ناز شخصیتیں پیدا کیں اور ملت کی فکری اور عملی رہنمائی کرکے مسلمانوں کی تاریخ پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کئے، دارالعلوم کی ابتداء ایک انار کے درخت کے سائے میں ہوئی تھی، کسے معلوم تھا کہ یہ یہاں ایک چشمہ فیض جاری کیا جارہا ہے جس نے برصغیر کی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دیا اور پھر اس درس گاہ سے علم وفضل کے ایسے آفتاب و ماہتاب پیدا ہوئے جنہوں نے ایک دنیا کو جگمگا کر رکھ دیا۔ درسگاہیں دنیا میں بہت سی قائم ہوئیں ہیں اور دینی درسگاہوں کا بھی کسی دور میں فقدان نہیں رہا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم کو جو فضیلت اور امتیاز بخشا ہے بہت کم علمی اداروں کے حصے میں آتا ہے'' (38)

مولانا قاری محمد طیبؒ، دارالعلوم دیوبند کے مسلک ومشرب، علمی، روحانی اور اخلاقی کے اثرات کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''علمی حیثیت سے یہ ولی اللہی جماعت، مسلکا، اہل سنت والجماعت ہے جس کی بنیاد قرآن وسنت اور اجماع وقیاس پر قائم ہے اور اس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، دارالعلوم کے فیض یافتہ ایک طرف علمی وقار استغناء (علمی حیثیت سے اور

غناءِ نفس اخلاقی حیثیت سے) کی بلندیوں پر فائز ہوئے، وہیں فروتنی خاکساری اور ایثار و زہد کے متواضعانہ جذبات سے بھر پور ہوئے، علم واخلاق، خلوت وجلوت اور مجاہدہ و جہاد کے مخلوط جذبات سے ہر دائرہ دین میں اعتدال اور میانہ روی ان کے مسلک کا امتیازی نشان بن گئی، اس دارالعلوم کا فاضل درجہ بدرجہ بیک وقت محدث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی اور حکیم مربی ثابت ہوا۔ دارالعلوم نے اپنی علمی خدمات سے شمال میں سائبیریا سے لے کر جنوب میں سماترا اور جاوہ، اور مشرق میں برما سے لے کر مغربی سمتوں میں عرب اور افریقہ تک علوم نبویہ کی روشنی پھیلا دی، جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں صاف نظر آنے لگیں۔

دوسری طرف سیاسی خدمات سے بھی اس کے فضلائے کرام نے کسی وقت بھی پہلو تہی نہیں کی، حتی کہ 1803ء سے لے کر 1947ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ تمام شعبہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ تعلیم کو حاصل رہی اور اسی پہلو کو دارالعلوم نے نمایاں رکھا۔ اس لیے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم ومعرفت، جامع عقل وعشق، جامع عقل واخلاق، جامع مجاہدہ وجہاد، جامع دیانت و سیاست، جامع روایت ودرایت، جامع خلوت وجلوت، جامع عبادت و مدنیت، جامع حکم وحکمت، جامع ظاہر وباطن اور جامع حال و قال ہے''(39)۔ دارالعلوم دیوبند نے کیسے کیسے عظیم علماء، وفقہاء پیدا کئے؟ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ لکھتے ہیں: ''ہر شخص کا ایک درجہ ہوتا ہے ہر کس وناکس کے کلام کی تاویل نہیں کی جاتی میرا عقیدہ اکابر دیوبند اَعْلَی اللّٰہُ مَراتِبھُم نَوَّر اللّٰہُ مَرْقَدھُم کے متعلق یہ ہے کہ وہ جہابذۂ علوم ہیں، ان کے کلام میں غلطی تو ہوسکتی ہے مگر ان کی غلطی کو پکڑنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں''(40)

شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلویؒ، دارالعلوم دیوبند کے اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں: '' حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دور تجدید سے دین کی بقاء، فروغ ونیابت، فرائض رسالت کی بجا آوری انہیں کے مُنْتَسِبِیْن کے سپرد ہے، دارالعلوم دیوبند بھی اسی سلسلے کی سنہری کڑی ہے جسے من حیث الجماعۃ فرائض سہ گانہ نبوت کی ادائیگی اور جہاد فی سبیل اللہ کی سعادت اور تصلبِ دینی اور احقاق حق اور ابطال باطل، اشاعتِ اسلام اور ردِّ بدعات کی دولت نصیب ہوئی۔ کفر واستعمار کے مقابلہ میں دیوبند ایک عظیم قلعہ ثابت ہوا، دیوبند میراث نبوّت کا حامل وامین اور داعی ہے۔ جو نہ صرف برصغیر پاک وہند میں بلکہ پورے عالم اسلام میں ہمہ جہتی، رائض نبوت کا وراث، دعوت وارشاد، جہد و جہاد، حفاظت علوم رسالت، تعلیم ودعوتِ کتاب وسنت، تدریس واشاعت فقہ وکلام، تزکیہ قلوب وتربیت وتصفیۂ نفوس کا علمبدار ہے۔ دارالعلوم دیوبند کو برملا قاسمُ العلوم وَالْخَیْرَات، دَامُ الفُحُوْل وَالنَّوابِع کہا جا سکتا ہے جس کے فیوض عامہ سے بحمد اللہ تعالیٰ نہ صرف پورا ہند و پاک سیراب ہے بلکہ اس کا سایۂ برکت اور ظل سعادت ورحمت اقصائے عالم پر محیط ہے''(41)۔

شیخ الحدیث مولانا نذیر احمدؒ، دارالعلوم دیوبند کے اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''برصغیر پاک وہند میں ایسی ایسی عظیم اور مقدس شخصیات پیدا ہوئیں ہیں جن کی نظیر ملنا مشکل ہے خصوصاً دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے والے علمائے حق جن کی علمی، دینی، روحانی اور سیاسی وملی خدمات جلیلہ ناقابل فراموش ہیں۔ان اکابر علماء و اولیاء کی مقدس زندگیاں ہمارے لیے مشعل رہ کا درجہ رکھتی ہیں''(42)۔

دارالعلوم دیوبند کے سیاسی اثرات

محمد اکبر شاہ، دارالعلوم دیوبند کی سیاسی خدمات واثرات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سیاسی میدان میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات سورج کی طرح روشن ہیں، آزادی ہند کی تحریک اور پھر تحریک پاکستان میں دارالعلوم کے اکابر واصاغر نے خوب خوب حصہ لیا، اور مسلم لیگ کی تائید وحمایت کرکے تحریک پاکستان کو زبردست تقویت بخشی، پاکستان کا وجود قائداعظم مرحوم کے بعد اکابر دیوبند کے مرہون منت ہے۔...ہمارا ایمان ہے کہ اکابر علمائے دیوبند اگر مسلم لیگ میں شرکت کرکے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کے سواد اعظم کی پیروی نہ کرتے تو مسلم لیگ کی طرف ہوا کا رخ موڑنا اور نظریہ پاکستان کی طرف سیاست کے دھارے کا منہ پھیرنا ناممکن نہیں تو دشوار بہت تھا۔اس سلسلہ میں علامہ خالد محمود صاحب فرماتے ہیں:

یہ کہنا تاریخی حقائق کا منہ چڑانا ہے کہ دارالعلوم کے تمام خدام یا متعلقین کانگریس کے موئید تھے، دارالعلوم کے سرپرست حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کی علی الاعلان حمایت کی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کے لئے بہتر قرار دیا۔دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پاکستان کی نہ صرف پرزور حمایت کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قائداعظم کے بعد تصور پاکستان میں رنگ بھرنے کا سب سے مؤثر عمل حضرت علامہ عثمانیؒ ہی کا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔آپ نے قرار داد پاکستان کے حق میں بیان جاری فرمائے، جمعیت علمائے اسلام کی بنیاد رکھی، مضامین لکھے پرزور تقاریر کیں۔صوبہ سرحد اور سلہٹ مشرقی پاکستان کا ریفرنڈم تو شیخ الاسلام نے جیتا تھا، شیخ الاسلام اگر پاکستان کی حمایت کے لیے نہ نکلتے تو آج یہ علاقے بھی ہندوستان کے پاس ہوتے، صوبہ سرحد اور سلہٹ کی پاکستان میں شمولیت دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور محدث اعظم کا پاکستان پر احسان عظیم ہے(43)۔

- دارالعلوم دیوبند نے بہت بڑی تعداد میں ایسی شخصیات پیدا کیں جو علم وعمل، دین وسیاست، اُمت مسلمہ کی قومی و دینی ضروریات و تقاضوں، ضروریاتِ دنیا اور فکر آخرت کا حسین امتزاج و توازن، عظیم مدبّر ومفکر، نہایت ذہین، مختلف النوع خصوصیات، صفات وصلاحیتوں کے مالک تھے۔
- دارالعلوم دیوبند ایک عظیم علمی ودینی بین الاقوامی یونیورسٹی ہے، اس کی نظیر پوری دنیائے اسلام میں ملنا مشکل ہے۔

اگر چہ مصر میں جامعہ ازہر بھی ایک عظیم جامعہ اور علمی مرکز ہے، جس کو اسلامی سلطنت کی سرپرستی ہمیشہ سے حاصل رہی ہے۔ لیکن روحانیت اور علمیت کا بہترین امتزاج جو سرزمین دیوبند کی اس جامعہ میں ملتا ہے وہ دنیا کے کسی علمی ادارے میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتا۔

- دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں مسلماں آباد ہوں اور وہاں دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے علماء یا اُن کے اثرات نہ پہنچے ہوں
- دارالعلوم دیوبند کے فیضان نے ایک طرف تو ایسی شخصیتیں پیدا کیں جن میں سے ہر شخص اپنی جگہ مستقل جماعت کی حیثیت رکھتا تھا، جنہوں نے تعلیم وتصنیف، تزکیۂ نفوس، تہذیب اخلاق، افتاء ومناظرہ، صحافت وخطابت، دعوت وتبلیغ، حکمت وطب میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ دارالعلوم دیوبند کے تربیت یافتہ افراد نے نہ صرف برصغیر پاک وہند میں بلکہ پوری دنیا میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اور دوسری طرف برصغیر پاک وہند میں لاکھوں مدارس دینیہ قائم ہو چکے ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ رواں دواں ہے۔
- دارالعلوم دیوبند کے اثرات رفتہ رفتہ پھیلتے رہے، علی گڑھ کے علاوہ ملک میں دوسرے سیاسی و دینی، ثقافتی اور تہذیبی حلقے بھی دیوبند سے متاثر ہوئے، دیوبند کے اثرات ملک کے اداروں اور شخصیات ہی پر نہیں بیرونِ ملک کی اکابر شخصیات پر بھی پڑے اور ادارے بھی ان سے متاثر ہوئے، دارالعلوم دیوبند کی ملّی و سیاسی تحریک سے افغانستان، ترکی، اور حجاز کی متعدد اہم شخصیات متاثر تھیں، کیونکہ دارالعلوم دیوبند کے سند یافتہ علماء نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان، حجاز و دیگر ممالک میں درس وتدریس اور تبلیغ واشاعت کے ذریعہ علوم دینیہ کی اشاعت اور اوہام باطلہ کے ازالہ میں مصروف ہیں۔
- اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ تاریخ اسلام کا کوئی بھی ایسا دور نہیں جو علمائے ربانی اور رجال حقانی سے خالی رہا ہو، ہر دور میں بڑے بڑے علماء وفقہاء پیدا ہوتے رہے جنہوں نے آفتاب ومہتاب بن کر کفر، شرک اور جہالت کی گہری تاریکیوں میں اُمت مسلمہ کو راہِ حق دکھائی اور انہیں صراط مستقیم پر ڈالا۔

ریک علی گڑھ:

مسلم مفکرین کا دوسرا گروہ جس کو متجددین کہا جاتا ہے اس فکر کے داعی سرسید احمد خان دہلوی (1234ھ/ 1818ء-131ھ/ 1898ء)(44) تھے ان کے نزدیک مسلمانوں کی اس وقت اصلاح اور کامیابی اس میں تھی کہ مسلمان انگریزی زبان ر جدید علوم حاصل کر کے اپنے مد مقابل ہندوؤں کے ہم پلہ ہو سکتے ہیں کیونکہ برطانوی حکومت بہت زیادہ مضبوط ہے اس کو سلمان اپنی کسی عملی جدوجہد سے ہٹا نہیں سکتے۔

انگریزوں نے ہندوستان پر قابض ہونے کے ساتھ ہی اسطرح کی تعلیمی پالیسی بنائی جس کے نتیجہ میں ہندو بڑی تعداد میں جدید تعلیم حاصل کر کے حکومت میں ملازمت حاصل کر رہے تھے اور مسلمان جدید تعلیم سے محروم ہونے کی وجہ سے سرکاری ملازمتوں سے محروم تھے۔ سرسید احمد خان کی فکر کا حاصل یہ تھا کہ مسلمان انگریزی معاشرت اور انگریزی کلچر اختیار کر لیں تا کہ انگریزوں کی نظر میں وہ عزت حاصل کر سکیں سید طفیل احمد منگلوری سرسید کی اصلاحی کوششوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مسلمانوں کو ذلت سے نکالنے کے لئے سرسید نے دو طریقے اختیار کئے اول ''اصلاحِ معاشرت'' اور دوسرے ''اصلاح مذہب''، اصلاح معاشرت کے لیے سرسید نے 1857ء کے بعد ہی سے انگریزی تمدن اختیار کر لیا تھا، اور انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا تھا جو دیندار مسلمانوں کو ناگوار تھا مگر انگلستان سے لوٹ کر سرسید نے یہ اضافہ کیا کہ اس کام کی باقاعدہ تبلیغ شروع کر دی یہی طریقہ ترکوں نے بھی اپنے ملک میں جاری کیا تھا۔ اس لیے سرسید کو اپنے خیالات میں بہت تقویت ہوئی، اور اپنی کتاب ''تہذیب الاخلاق'' میں لکھتے ہیں:-'' ترکوں کا تمام لباس بجز ٹوپی کے بالکل یورپین ہے سب نے زمین پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے میز کرسی پر بیٹھتے ہیں، میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے مکان کی آراستگی اور طریقہ بالکل یورپیوں کا سا ہے۔ جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو ہم جولی معلوم ہوتے ہیں اور امید ہے کہ روز بہ روز اور بھی زیادہ مہذب ہوتے جاتے جائیں گے۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے ہیں کہ اپنے تعصّبات اور خیالات خام کو چھوڑ دیں اور تربیت و شائستگی میں قدم بڑھائیں'' (45)۔ سید طفیل احمد سرسید کی تحریک اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ مذہب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مندرجہ بالا نظریہ کے مطابق عیسائیوں کے ساتھ کھانے پینے میں چونکہ ان کا ذبیحہ منع تھا اس لیے سرسید نے مسلمانوں کے لیے گردن مروڑی مرغی کا کھانا آیات و احادیث سے جائز قرار دیا جوتہ پہن کر نماز پڑھنا عام طور پر معیوب تھا، کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، داڑھی منڈوانا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ان سب چیزوں کے جواز کو سرسید نے مذہب سے ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور قبل اس کے کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی حقیقی ترقی کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کئے جاتے اس قسم کی بحثوں سے سرسید سے مسلمان بالعموم بھڑک گئے... مسلمانوں کے مذہب کی خصوصیت جمعیت اور جماعت ہے اور ان کے ہاں انفرادی عبادت صرف مجبوری کی حالت میں کی جاتی ہے۔ مگر سرسید مسلمانوں کے مذہبی اجتماعات سے نہ صرف علیحدہ رہتے تھے بلکہ خوشی کے مواقع پر بھی مسلمانوں کے مفلس اور جاہل ہونے کا سوگ مناتے تھے اور عید کے دن کبھی کبھی مسلمانوں کی بربادی کے متعلق مضامین لکھتے تھے جن میں روزہ رکھنے والوں اور تراویح پڑھنے والوں کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا ...مگر حقیقت یہ ہے کہ سرسید کو عمل یا عبادت کے ذریعہ مسلمانوں کی جمعیت قائم رکھنے کی طرف توجہ نہ تھی۔ وہ

ذہانت اور ذہنیت دونوں کے اعتبار سے عام مسلمانوں سے اس قدر زیادہ بلند تھے کہ مذہبی امور میں نہ صرف یہ کہ ان کے برابر کوئی شخص نہ چل سکتا تھا بلکہ ان کے پیچھے رہ کر بھی ساتھ نہ لگ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے تعلیمی مشن کے ساتھیوں اور دوستوں میں سے بجز ایک دو کے کوئی ان کی مذہبی اصلاح کے کام سے متفق نہ تھا'' (46)۔

سید طفیل احمد لکھتے ہیں: '' کاش سرسید کی یہ ناکامی محض مذہبی اصلاح کے کام تک محدود رہتی مگر بدقسمتی سے مذہبی امور میں تجاوز کرنے سے ان کی مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی۔ علماء اور مشائخ کے ساتھ کشاکش میں دونوں طرف دماغی توازن باقی نہ رہا اور سرسید نے اس زمانہ کے علماء سے گزر کر تمام قدیم مفسرین کی روایات کو لغو اور بیہودہ قرار دیا۔ اور انہیں علماء یہود کا نہ صرف مقلد بلکہ ان سے ایک قدم آگے بڑھا ہوا بتایا اور لکھا کہ: '' ہمارے مفسرین نے ایسے ناپاک طریقہ سے (فلاں) مسئلہ کو محمول کیا کہ بجز اس کے کہ خدا انہیں معاف کرے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا'' اسی کے ساتھ سرسید نے اپنی ذاتی رائے کی نسبت یہ دعویٰ کیا: '' ہمارے سوا تمام مفسرین اور علماء متقدین میں (فلاں) آیت کے معنی الٹے سمجھے مگر اس کہنے کی ہمیں پرواہ نہیں''۔

'' سرسید کی ان تحریرات کے مقابلہ میں علماء کی جماعت کے حملے سرسید اور علی گڑھ کے مجوزہ مدرسۃ العلوم پر ہوتے تھے جو وجود میں نہ آیا تھا اور اس کشاکش نے ایک ایسا لٹریچر پیدا کر دیا تھا جو دونوں کے لیے شرمناک تھا اس سے بظاہر فریقین کو اور دراصل کل قوم کو نقصان پہنچا علماء کے اعتراضات سے سرسید کی تعلیمی تحریک عام مسلمانوں کے نزدیک مشتبہ ہوگئی اور سرسید کے اعتراضات سے علماء متقدین اور متاخرین کی وقعت سرسید کے متبعین کے دلوں سے اٹھ گئی'' (47)۔

ان مشکل، گوناگوں اور نامساعد حالات اور ناسازگار ماحول میں تمدنی اور مذہبی اصلاح کے ساتھ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کا کام شروع کیا۔ چنانچہ اپریل 1869ء میں تعلیمی اصلاحی مقصد کے لیے برطانیہ کا سفر کیا اور اکتوبر 1870ء میں واپس بنارس آئے (48) اس سفر کے دوران یورپ کی قومی ترقیوں اور انکی تعلیمی و معاشرتی حالات کا مشاہدہ کیا، تو سرسید کا نقطہ نظر تعلیم کے بارے میں بالکل بدل گیا انہوں نے اعلیٰ قسم کی تربیت کو جو سرکاری تعلیمی اداروں میں مقصود تھی نظامِ تعلیم کا اہم جزو قرار دیا، لوگوں کے مطمع نظر میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے 1870ء میں '' رسالہ تہذیب الاخلاق'' جاری کیا (49)۔

اسی زمانہ میں اپنے انقلابی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دو کمیٹیاں قائم کیں پہلی کمیٹی '' خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ''، تھی اس کمیٹی کی ذمہ داری ان اسباب کا کھوج لگانا تھا کہ برطانوی حکومت سے جو فائدہ عام لوگ حاصل کر رہے ہیں مسلمان ان سے استفادہ کرنے سے کیوں محروم ہیں (50) اس کمیٹی کی کاوشوں سے اہل فکر نے تقریباً پچیس کے قریب مضامین لکھے جن کا حاصل یہ تھا کہ تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کی بہ نسبت کم ہے، اور سرکاری مدارس کا تعلیمی نصاب مسلمانوں کے لیے ناکافی ہے اور مسلمانوں کے پاس اپنے قدیم علوم کو محفوظ رکھنے اور علوم جدیدہ سے مستفید ہونے اپنی ضروریات اور اپنی اولاد کی

صحیح تعلیم وتربیت کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اپنی تعلیم کی خود فکر کریں (51)۔

چنانچہ اسی کمیٹی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ 1875ء میں ایک ابتدائی مدرسے کی بنیاد پڑی جو 1877ء میں علی گڑھ کالج بنا اور 1881ء کے بعد ایم .اے .او کالج کے نام سے موسوم ہوا (52) اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسی مدرسے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دوسری کمیٹی ''خَزِینَۃ البضاعۃ'' قائم کی۔اس کمیٹی کے ذریعے تعلیمی منصوبوں کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا مسلمان عموماً سرسید سے ناراض تھے جس کی وجہ سے فی الوقت ان کی طرف سے کوئی خاص چندہ نہ ملا البتہ حکام وقت سے چندہ ملنا شروع ہوگیا (53) ۔انہی ایام میں ایک اور اہم کام سرسید نے یہ کیا کہ 1886ء میں نیشنل کانگریس کے قیام کے ایک سال بعد'' آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' کی بنیاد ڈالی (54) جس کے ذریعے سرسید کے افکار پھیلے اوران کو عملی جامہ پہنانے کے لیے راہ ہموار ہوئی۔

تحریک علی گڑھ کے مقاصد

تحریک علی گڑھ کے مقاصد سرسید کی تحریرات کے مطابق حسبِ ذیل تھے:

- ''ایسا کالج قائم کرنا جس میں مسلمان زبان اور علوم انگریزی حاصل کریں اوران کے ساتھ دینیات سے بھی کافی واقفیت حاصل کریں''۔
- ''کالج سے متعلق ایک بورڈنگ ہاؤس قائم کرنا جس میں مسلمان اپنے بچوں کو اس اطمینان سے رکھ سکیں کہ انکی نگہداشت اور چال چلن کی نگرانی مثل گھر کے ہو''۔
- ''اس کالج میں ایسی تعلیم دینا جو طلبہ کی عقلی قوت بڑھانے کے ساتھ جسمانی قوتوں کو بڑھائے اوران میں پسندیدہ اطوار اور اخلاقی لحاظ سے عمدہ چال چلن پیدا کرے''۔
- ''ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنتِ انگریزی کے لائق اور کارآمد بنانا''(55)۔

سرسید اسٹوڈنٹ یونین کلب کے افتتاح ۲۶،اگست 1301ھ/1884ء کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اپنے نظریات اور تحریک کے مقاصد کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اگر تم حاضرین کی خواہش یہ ہے کہ ہم قوموں میں عمدہ تعلیم پھیلے،تو سب سے عمدہ حکمتِ عملی یہ ہے کہ کریسنٹ (ہلال) اور کروس (صلیب) کو ملادو۔بعض انگریز اور بعض ھندوستانی دوست یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔مگر میرا یہ خیال ہے کہ ایک دن ایسا ہوگا کہ دونوں اس طرح + ☪ مل جائیں گے(56)۔

سرسید کے اس مجوزہ کالج کو برطانوی حکومت کی طرف سے بڑی پزیرائی ملی۔ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ڈلٹن صاحب بہادر نے اس کالج کا افتتاح کیا اور اعلیٰ حکام اکثر یہاں کا دورہ کرتے رہتے تھے اور طلبہ کو وظائف اور انعامات دیتے تھے (57)۔

سرسید احمد خان کالج کا الحاق کیمبرج سے کرنا چاہتے تھے لیکن اس کا الحاق پہلے کلکتہ یونیورسٹی سے رہا پھر الہ آباد یونیورسٹی سے ہوگیا اور سرسید کی وفات کے بعد آغا خان سوم نے کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے کی تحریک کی قیادت سنبھالی اور ایک بھرپور جدوجہد کے بعد 1921ء میں ''علیگڑھ مسلم یونیورسٹی'' وجود میں آئی (58)۔

سرسید نے تحریک اشاعت علوم جدیدہ کو خوب پھیلایا، سارے ملک میں اسلامیہ اسکول، اسلامیہ کالج کھل گئے اور ان کو اپنے مقاصد میں بہت کامیابی ہوئی مسلمانوں کو ایک عرصہ سے سرکاری ملازمتیں نہ مل رہی تھیں اب سرکار نے یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کو سرکاری ملازمت دینا شروع کردیں، اس تحریک سے مسلمانوں کے لیے معاشی بہبود کے راستے کھل گئے اور ان میں مادی خوشحالی بھی آ گئی مگر روحانیت کے اعتبار سے کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کرسکے اور بعد کے مسلمان واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوتے گئے

جامعہ ملیہ اسلامیہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بھی علی گڑھ کے طرز کی ایک مغربی درس گاہ ہے تحریکِ خلافت (1338ھ- 1345ھ/1919ء -1926ء) کے ہنگامہ خیز دور میں علی گڑھ یونیورسٹی کی روایتی انگریز دوستی کو بعض طلبہ جن میں دینی اور ملّی غلبہ زیادہ تھا پسند نہ کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مقابل 1920ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی بنیاد رکھی ان طلبہ کے قائد مولانا محمد علی جوہر تھے اور سربراہ حکیم محمد اجمل خان اور خواجہ عبدالمجید بی-اے کیمبرج کو پہلا پرنسپل مقرر کیا گیا، اور تصدق احمد خان شروانی، محمد علی قصوری، مولانا عبدالقادر قصوری وغیرہ نے مالی معاونت کی (59) ۔

اس درسگاہ کا افتتاح شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ہاتھوں علی گڑھ کی جامع مسجد میں ہوا۔ اور بعد میں یہ درسگاہ دہلی منتقل ہو گئی، اس درسگاہ کا تعلیمی نصاب خود بانیان کا اپنا تجویز کردہ تھا اس لیے حکومت ہند نے نہ تو علی گڑھ کی طرح اسکی مالی معاونت کی اور نہ اُسے تسلیم کیا اس لیے یہاں کے فارغ التحصیل حضرات کو سرکار نے ملازمت دینے سے انکار کردیا (60)۔

جامعہ ملیہ کے مقاصد

مولانا محمد علی جوہر نے نصاب کمیٹی کے مشورہ سے جو ''تعارفی کتابچہ'' تصنیف کیا اس میں اس جامعہ کا مقصد یہ مقرر کیا گیا کہ: ''ہمارا مطمع نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درسگاہ سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو نہ صرف حسبِ معیار زمانہ حال، تعلیم وتربیت یافتہ شمار کئے جانے کے مستحق ہوں، بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں، جن میں اسلام کی روح ہو، اور جو اپنے مذہب سے اس قدر کافی بہرہ یاب ہوں کہ مبلغین اسلام کی فوج میں دوسروں کی امداد سے مستغنی اور بے نیاز ہوکر خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں اس مقصد کے لیے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل کرنے کو ہم نے اپنی تعلیم کا سنگِ بنیاد قرار دیا ہے'' (61)۔

جامعہ ملیہ کے نصابِ تعلیم کے متعلق مولانا محمد علی جوہر کا خیال یہ تھا کہ:

''اس طرح پہلی مرتبہ علم دین ودنیا ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہوں گے جس سے بلاشبہ دونوں منفعت پذیر ہوں گے اور مغائرت کا وہ پردہ جو دونوں کے درمیان حائل ہے اور جس نے علم دین کو بے حس اور علم دنیا کو بے روح اور دوراز خدا بنا رکھا ہے، اُٹھ جائے گا'' (62)۔

اس درس گاہ کے نصاب میں عربی ادب پر زیادہ زور دیا گیا اور ذریعہ تعلیم اردو میں رائج اور انگریزی ایک لازمی مضمون کے طور پر نصاب میں شامل کی گئی، اور طلبہ کی تعلیم میں مذہبی تربیت پر خاص توجہ دی گئی، اور صنعت وحرفت کی تعلیم مثلاً دستکاری، تجاری قفل سازی، پارچہ بافی، ڈیری فارمنگ اور کیمیاوی صنعت وغیرہ بھی شامل نصاب تھا تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل آزادانہ پیشہ اختیار کر کے باعزت کامیاب زندگی گزار سکیں (63)۔

اس درس گاہ کو ایک ایسا مثالی ادارہ بنانے کی کوشش کی گئی جس کا تمام نظام العمل اسلامی خصائص اور قومی احساسات پر مبنی ہو، علی گڑھ اور دیوبند کے نصاب تعلیم میں بنیادی تضاد کی وجہ سے اختلافات کی جو خلیج حائل تھی اس کو کم کرنے میں مدد مل سکے (64)۔علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان ملکر کام کرنیوالوں کے لیے ایک مرکز بنایا جائے لیکن اس میں کماحقہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور بالآخر مغربی طرز کی ایک جدید یونیورسٹی بن گئی۔اور دینیات میں علی گڑھ کی طرح کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کرسکی، چناچہ پروفیسر سید محمد سلیم لکھتے ہیں:

''یہ درس گاہ اگرچہ علی گڑھ کی ضد پر قائم ہوئی تھی لیکن فی الحقیقت یہ علی گڑھ تحریک کا ہی برنگِ دگر ایک ثمرہ ہے۔یہاں کے تمام کارکن اور اساتذہ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ تھے، بظاہر ان کا مزاج علی گڑھ سے مختلف ہے۔مگر یہ اختلافات انگریز دشمنی کے جذبات کی وجہ سے ہیں محنت ومشقت تصنیف وتالیف سب اسی کے اثرات ہیں۔اسلامی علوم اور ملی مقاصد کو فروغ دینے کے واضح مقاصد کے ساتھ یہ جامعہ قائم ہوئی تھی ...مگر جلد ہی اسکا اسلامی رنگ پھیکا پڑتا چلا گیا۔انگریز دشمنی میں اس درسگاہ کے منتظمین کانگریس میں شریک ہوگئے، بتدریج علی گڑھ یونیورسٹی ہی سے نہیں کٹ گئے، بلکہ مسلمانوں کے سواد اعظم سے بھی دور ہوتے چلے گئے۔اور متحدہ قوم پرستی کے ہم نوا بن گئے، علی گڑھ میں غفلت اور بداعمالی کی فضا طاری تھی تو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دین سے بے تعلقی اور وطنی قومیت کا رنگ غالب تھا'' (65)۔

ندوۃ العلماء کا قیام:

تحریک دیوبند اور علی گڑھ کے بعد تیسری بڑی تحریک ''ندوۃ العلماء'' تھی جو ان مذکورہ تحریکوں کے تقریباً تیس سال بعد شروع ہوئی۔اس تحریک کے محرکین کا ادّعا یہ تھا کہ یہ تحریک قدیم اور جدید دونوں علوم کی جامع ہوگی بالفاظ دیگر دیوبند اور علی گڑھ کا مجموعہ ہوگا (66)۔یہ تحریک اس وقت اُٹھی جب ملک میں متعدد تحفظ واحیائے اسلام کی قومی تحریکیں جاری تھیں اور اس عزم کے ساتھ

شروع کی گئی کہ وہ عوام کی اصلاح سے نہیں بلکہ علماء کی اصلاح سے تعلق رکھتی ہیں (67) اس فکر کے بانی مولانا شبلی نعمانیؒ تھے وہ تحریک کے مقاصد کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ''ہمارے درد کا علاج ایک معجون ہے جس کا ایک جزو مشرقی اور دوسرا مغربی ہے'' (68)۔

خوش نصیبی سے اسی طبقہ میں کچھ وسیع النظر اور انصاف پسند ایسے علماء تھے جن کی فکر یہ تھی کہ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی دعوت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جہاں زمانہ کی ضروریات کے مطابق قدیم اور جدید نصاب کی تدریس ہو سکے اور قدیم دینی نصاب کی کمزوریوں اور طرز تعلیم کے اندر موجود نقائص پر غور و فکر کر کے اس کی اصلاح کی جائے۔

چنانچہ اس فکر کے حامل مفکرین نے مولانا شاہ محمد علیؒ کی سرپرستی میں 1892ء/1310ھ ایک مجلس ندوۃ العلماء کے نام سے قائم کی۔ جس میں مولانا عبداللطیف علی گڑھ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ، کچھ شیعہ اور اہل حدیث علماء شامل تھے (69)۔

ندوۃ العلماء کے قیام کے بنیادی مقاصد:

ندوۃ العلماء کے قیام کے بنیادی مقاصد حسب ذیل تھے:

- نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، تہذیب اخلاق اور شائستگی اطوار۔
- علماء کے باہمی نزاع کا رفع اور اختلافی مسائل کا انسداد۔
- عام مسلمانوں کی اصلاح و فلاح اور اس کی تدابیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات سے علیحدہ۔
- ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم کا قیام جس میں علوم و فنون کے علاوہ عملی صنائع کی بھی تعلیم ہو۔
- محکمہ افتاء کا قیام (70)۔

مجوزہ دارالعلوم کے قیام کی منظوری مجلس کے پہلے ہی اجلاس منعقدہ شوال 1311ھ/ 1893ء میں دے دی گئی تھی لیکن نصاب کی تعین میں پانچ سال لگ گئے۔ بالآخر اس کے نصاب میں قدیم اور جدید علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی کو بھی شامل کیا گیا 1316/1898ء میں مدرسہ ندوۃ العلماء نے باقاعدہ شکل اختیار کر لی اور مولانا شبلی نعمانی علی گڑھ کی درس گاہ کو چھوڑ کر ندوۃ آ گئے اور تدریس شروع کر دی (71)۔

دیوبند اور علی گڑھ کو جو مقبولیت اپنے اپنے حلقوں میں حاصل ہوئی وہ مقبولیت ندوۃ کو تو حاصل نہ ہو سکی اور اس طرز تعلیم کو ''جامعہ عباسیہ بہاولپور'' کے علاوہ کہیں نہیں اپنایا گیا، البتہ چند ایسی نامور شخصیات ضرور پیدا کیں جن کی اسلامی خدمات قابل

تعریف ہیں ۔مولانا شبلی نعمانیؒ کی وجہ سے ندوۃ نے دوسرچشموں علی گڑھ، اورازھر، سے استفادہ کیا تھا۔شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:
''ندوہ نے ان دونوں سرچشموں سے فیض حاصل کر کے ایسے علماء پیدا کئے ہیں جن کی نظر رفتارِ زمانہ پر رہتی ہے اور جوایک خاص اسلوب کے ماتحت قوم کی عملی ضروریات کو پورا کرنا چاہتے ہیں ۔ندوۃ کے فارغ التحصیل طلبہ میں سب سے زیادہ قابل سید سلیمان ندوی ہیں۔ جنہیں ملک کے بہترین علماء کے مقابل پیش کیا جاسکتا ہے ان کے علاوہ مولانا عبدالسلام، سید نجیب اشرف، اور مولوی ابوظفر ایسی ہستیاں ہیں جن پر ندوۃ بجا طور پر فخر کرسکتا ہے اردو زبان کا سب سے مقبول اور بااثر اسلامی رسالہ معارف ندوۃ ہی کے سابق طلبہ چلا رہے ہیں''الہلال'' کو ندوۃ کی زبان سمجھنا چاہیئے ،مولانا ابوالکلام آزادخود دیر تک ندوۃ میں مقیم رہے اور مستفید ہوئے ۔دارالمصنفین آج قدیم اسلامی علوم کی اشاعت کا اہم مرکز ہے اور اگر چہ ندوۃ کا چراغ مدھم پڑ گیا ہے لیکن اس سے تیل لے کر اعظم گڑھ میں جو شمعیں جلائی گئی تھیں وہ برابر ضوافشاں ہیں''(72)۔

حواشی وتعلیقات

(1) کاشمیری، آغا شورش، تحریک ختم نبوت، ص:11، الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار لاہور، 2003ء۔

(2) سید محمد سلیم، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت: ص، 205، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہور 1993ء۔

(3) سید محمد سلیم، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت، ص، 205۔

(4) ایضاً، 208۔

(5) ایضاً، 209۔

(6) ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص:129، مکی دارالکتب اردو بازار لاہور، 1997ء۔

(7) سید محمد سلیم، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت: ص، 211۔

(8) ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص:144۔

(9) عبداللہ علی یوسف، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص:218، دوست ایسوی ایٹس اردو بازار لاہور، 1996ء

(10) ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص:117، 157۔

(11) منگلوری، سید طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص:171۔

(12) سید محمد میاں، علماء ہند کا شاندار ماضی، 19:5۔

(13) سر سید احمد خان، اسباب بغاوتِ ہند، ص:119، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی 1986ء۔

(14) ایضاً، ص:120۔

(15) ایضاً، ص:121۔

(16) ایضاً، ص:122۔

(17) ایضاً، ص:124۔

(18) ایضاً، ص:126۔

(19) سید محمد سلیم، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت: ص، 251۔

(20) رضوی، سید محبوب احمد، تاریخ دارالعلوم دیوبند، 13:1، میر محمد کتب خانہ آرام باغ، کراچی، سن ندارد۔

(21) سید محمد میاں، علماء ہند کا شاندار ماضی، 65:5، مکتبہ محمودیہ لاہور، 1992ء۔

(22) رضوی، سید محبوب احمد، تاریخ دارالعلوم دیوبند 13:1۔

(23) سوانح میاں جی نور، ص:170، بحوالہ، حافظ مومن خان عثمانی، ص:100، المیزان ناشران وتاجران کتب اردو بازار لاہور، 2010ء۔

(24) رضوی، سید محبوب احمد، تاریخ دارالعلوم دیوبند، 159:1۔

(25) سید محمد میاں، علماء ہند کا شاندار ماضی، 66:5-68۔

(26) ایضاً،5:69۔

(27) عبدالحی الحسنی، نزھة الخواطر،8:152-158،طیّب اکادمی، بیرون بوہر گیٹ، ملتان،1993ء۔

(28) رضوی، سید محبوب احمد، تاریخ دارالعلوم دیوبند،2:125۔

(29) عبدالحی الحسنی ،نزھة الخواطر،7:420-422 ۔

(30) ایضاً،8:550-552۔

(31) رضوی، سید محبوب احمد، تاریخ دارالعلوم دیوبند2:221-222 ۔

(32) ایضاً،2:225-226۔

(33) مفتی محمد شفیع، امداد المفتین کامل،87-88،دارالاشاعت کراچی،1977ء۔

(34) قاری محمد طیبؒ، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مکمل و مدلل،1:27،دارالاشاعت کراچی، 1986ء۔

(35) رضوی، سید محبوب احمد، تاریخ دارالعلوم دیوبند،1:152 -155۔

(36) محمد زکریا، تاریخ مظاہر،1:5، کتب خانہ اشاعت العلوم محلّہ مفتی، سہارنپور،1972ء۔

(37) شاہجہانپوری، ڈاکٹر ابوسلمان، تاریخ دارالعلوم دیوبند،1:83-84۔

(38) بخاری، حافظ محمد اکبر شاہ، اکابر علمائے دیوبند،ص:07،ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور،1999ء۔

(39) بخاری، حافظ قاری محمد اکبر شاہ، بیس علمائے حق،ص:19،مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور،1999ء۔

(40) کاندہلوی، مورنا محمد زکریا، اکابر علمائے دیوبند اتباع شریعت کی روشنی میں،ص:23،عمر پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور،2004ء۔

(41) بخاری، حافظ محمد اکبر شاہ، اکابر علمائے دیوبند،ص:11،ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور،1999ء۔

(42) بخاری، حافظ قاری محمد اکبر شاہ، بیس علمائے حق،ص:13،مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور،1999ء۔

(43) بخاری، حافظ قاری محمد اکبر شاہ، بیس علمائے حق،ص:20-21،مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور،1999ء۔

(44) شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر،ص:77،ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور1995ء۔

(45) منگلوری، سید طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص:225،حماد المکتبی شیش محل روڈ لاہور۔

(46) ایضاً،ص:228-230۔

(47) ایضاً،ص:230-231۔

(48) شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر،ص:86۔

(49) معین الدین عقیل، تحریک پاکستان کا پسِ منظر،ص:72،ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہو1992ء۔

(50) منگلوری، سید طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص:223۔

(51) ایضاً،ص:233۔

(52) شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر،ص:88۔

(53) منگلوری، سید طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص:234۔

(54) معین الدین عقیل، تحریک پاکستان کا پسِ منظر، ص:73۔

(55) سید محمد سلیم، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، ص:271، بحوالہ ''تاریخ مدرسۃ العلوم'' ص133، سید افتخار عالم، مطبع مفیدِ عام آگرہ، مطبوعہ، 1901ء ۔

(56) سید محمد سلیم، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت: ص، 272۔

(57) شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص:93۔

(58) معین الدین عقیل، تحریک پاکستان کا پسِ منظر، ص:79۔

(59) منگلوری، سید طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص:245۔

(60) سید محمد سلیم، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت: ص، 283 ۔

(61) ایضاً، 284۔

(62) ایضاً، 284۔

(63) شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص:155۔

(64) معین الدین عقیل، تحریک پاکستان کا پسِ منظر، ص:79 ۔

(65) سید محمد سلیم، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، ص، 285-286 ۔

(66) شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص:353 ۔

(67) منگلوری، سید طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص:310۔

(68) سید محمد سلیم، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، ص، 288 ۔

(69) ایضاً، ص289۔

(70) شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص:187۔

(71) سید محمد سلیم، ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، ص:290 ۔

(72) شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ص:191۔